بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

حکیم الامت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے اپنی مشہور تصنیف الفوز الکبیر میں اس امر کی صراحت فرمائی ہے کہ قرآن مجید میں جو مختلف قوموں کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں اُن کی حیثیت زیبِ داستاں کی نہیں بلکہ عبرت کی ہے تاکہ آنے والی قومیں گزری قوموں کے افکار و اعمال کو دیکھ کر اُن راستوں کو پہچان سکیں جو قوموں کو تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ شاہ صاحب نے قرآن حکیم کے اسی پہلو کو التذکیر بایام اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قرآن مجید کی تلاوت کے وقت یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ جب اس میں کسی خاص قوم کے حالات کا ذکر کیا جا رہا ہو تو اگرچہ زیرِ بحث ایک مخصوص قوم ہی ہوتی ہے مگر قرآن کا خطاب دنیا کی ساری اقوام سے ہوتا ہے بلکہ بمصداق حدیث "لتتبعنّ سنن من قبلکم" زمانہ نبوی میں کوئی بلا ایسی نہ تھی جس کا نمونہ آج موجود نہ ہو۔ اس لیے ان حکایات سے مقصود اُن مقاصد کے لیے کلیات کا بیان ہے نہ کہ ان حکایات کی خصوصیات۔"

شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ کوئی اچنبھا نہیں بلکہ فطرت کے ایک عام اور بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہر نئی آنے والی حالت اور گزری ہوئی حالتوں کے درمیان کوئی مماثلت اور یکسانیت نہیں اور ہر نئے

دور یا ہر نئی حالت اور گزشتہ ادوار و احوال میں ایک نوعی فرق و اختلاف ہے تو پھر اجتماعی اور انفرادی تجربات کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی کیونکہ اس صورت میں تجربہ تمام ان حالات و واقعات سے ماخوذ قرار پائے گا جو نئے حالات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو نہ صرف انسانی تجربات بالکل بیکار ہو جاتے ہیں بلکہ خود تاریخ بھی گزشتہ حالات و واقعات کا ایک بے معنی مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے اور گزشتہ حالات و واقعات سے یا تاریخ سے کسی انسان کے لیے سبق حاصل کرنا بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ماضی سے درسِ عبرت صرف اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جب ہم یہ تسلیم کریں کہ زمانہ گزشتہ اور زمانہ حال میں کوئی بنیادی فرق یا تضاد نہیں۔ ہم جو ماضی کی داستانوں سے عبرت حاصل کرتے ہیں یا گزشتہ تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو ان کی تہ میں یہی اساسی تصور کارفرما ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں۔ ہمیں آج جو محرکات جنگ و صلح دوستی و دشمنی اور تعمیر و تخریب پر ابھارتے ہیں وہ اُن محرکات سے کسی طرح مختلف نہیں جو ازمنۂ گزشتہ کے انسانوں کو مذکورۂ بالا اعمال پر ابھارتے تھے۔ زمانہ اور حالات کے تغیر و تبدل کی بنا پر انسان اور انسان کے درمیان کسی نوعی فرق کو تسلیم کرنا نوعِ انسانی کی پوری تاریخ کی تکذیب کرنا ہے یا دوسرے لفظوں میں انسانی تجربات کی قدر و قیمت کا سرے سے انکار ہے۔ ماضی اور حال کے درمیان حقیقی تعلق اُسی صورت میں استوار کیا جا سکتا ہے جب یہ مان لیا جائے کہ یہاں ماضی ہی استقبال کا بھیس بدل کر حال کے اسٹیج پر جلوہ گر ہوتا ہے ورنہ اگر ماضی کے واقعات بنیادی اور اساسی طور پر حال کے واقعات سے مختلف ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ماضی کا مطالعہ ہمارے لیے یکسر عبث اور بیکار ہے اور اس کی حیثیت طلسمِ ہوشربا سے کسی طرح زیادہ نہیں۔ ماضی اور حال کے درمیان تعلق کی جو مختلف کڑیاں قائم کی جاتی ہیں وہ صرف اسی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں کہ جس طرح آج کی آگ میں اور ماضی کی آگ میں جلانے کی صلاحیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں بالکل اسی طرح ماضی کے انسان

اور آج کے انسان کے مابین جذبات و احساسات کے لحاظ سے کوئی اختلاف نہیں۔

ماضی اور حال کے درمیان اسی تعلق کی وجہ سے شریعتِ اسلامی میں قیاس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اگر ماضی اور حال کے واقعات میں بنیادی اور اساسی فرق ہوتا تو کسی خاص عہد کے ایک واقعہ سے دوسرے عہد کے اُسی نوعیت کے واقعہ پر استدلال نہ کیا جا سکتا۔ لیکن آج شریعتِ اسلامی میں قیاس کی مدد سے جو مختلف الجہتیں حل کی گئیں اور جس طرح ماضی کے واقعات سے استنباط کر کے حال کے مسائل کو سلجھایا گیا وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ تاریخ میں حالات و واقعات کا ایک ایسا تکرار دکھائی دیتا ہے جس سے بڑی آسانی کے ساتھ اُن حالات و واقعات کے متعلق چند بنیادی اصول و ضوابط مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ منطق کی اصطلاح میں اسی نوع کی کوششوں کو قیاس العلۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حافظ ابنِ قیّم نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف اعلام الموقعین کی جلد اوّل میں اس موضوع پر بحث کی ہے[1]۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ	تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں
فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ	چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ، هٰذَا بَيَانٌ	(اللہ کے احکام و ہدایت) کو جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے
لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ	لیے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے
(آل عمران: ۱۳۷-۱۳۸)	ڈرتے ہیں اُن کے لیے ہدایت اور نصیحت۔

اس آیت میں قرآن مجید لوگوں کو زمین میں چل پھر کر دیدۂ عبرت سے گزشتہ اقوام کے حسرتناک انجام کو دیکھنے کی جو دعوت دیتا ہے تو اس کی تہ میں یہی بنیادی تصوّر کارفرما ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے سے جس طرح ماضی کی قومیں تباہ و برباد ہوئیں بالکل اسی طرح

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے اعلام الموقعین جلد اول صفحہ ۱۳۰ تا ۱۳۸

تم بھی انہی کی روش پر چل کر انجام بد کو پہنچو گے۔ جب تمہارے درمیان علت یعنی "تکذیب رسل" ایک ہے۔ اس کے نتائج بھی یکساں ہونے چاہییں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ گزری ہوئی قوموں کو احکام خداوندی پس پشت ڈالنے کی وجہ سے ہلاک کر دے اور تمہیں اس غلط روش کی وجہ سے دنیا میں سربلندی عطا کرے۔ علت کی یکسانیت کی وجہ سے نتائج بھی ایک ہی نوعیت کے برآمد ہوتے ہیں۔

اسی حقیقت کو قرآن مجید ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ۔ (انعام ۶)

کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانہ میں دور دورہ رہا ہے۔ اُن کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا تھا۔ ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور اُن کے نیچے نہریں بہا دیں۔ مگر جب انہوں نے کفران نعمت کیا تو آخر کار ہم نے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور اُن کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا۔

حافظ ابن قیمؒ اس آیت کی تصریح میں فرماتے ہیں کہ گزشتہ اقوام کی ہلاکت و بربادی کی اصل وجہ اُن کی بداعمالیاں اور راہ حق سے انحراف تھا اور یہی وہ ایسی وجوہ تھیں جن کی بنا پر انہیں دنیا سے نیست و نابود کر دیا گیا تھا۔ پھر جس طرح انہیں اُن کی قوت و طاقت عذاب الٰہی سے قطعاً محفوظ نہ رکھ سکی اور ان کی شوکت و ثروت اُن کے کسی کام نہ آئی بالکل اسی طرح تمہیں بھی یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مال و دولت کی فراوانی، یہ خسروانہ جلال، اور یہ غیر مسئول اقتدار تمہیں خدا کی گرفت سے بالکل بچا نہیں سکتا۔ یہ سب چیزیں جنہیں آج تم اپنی زندگی کے بہت بڑے سہارے

سمجھتے ہو وقت آنے پر تمہارے لیے سانپ اور بچھو سے زیادہ خطرناک ثابت ہوں گی

اسی حقیقت کو پھر سورۂ توبہ میں دوسرے الفاظ میں بیان فرمایا:

كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَأَكْثَرَ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ ۚ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ۔

(التوبہ: ۶۹-۷۰)

تم لوگوں کے زنگ ڈھنگ وہی ہیں جو تمہارے پیش رووں کے تھے۔ وہ تم سے زیادہ زور آور اور تم سے بڑھ کر مال و اولاد والے تھے پھر انہوں نے دنیا میں اپنے حصے کے مزے لوٹ لیے اور تم نے بھی اپنے حصے کے مزے اسی طرح لوٹے جیسے انہوں نے لوٹے تھے اور ویسی ہی بحثوں میں تم بھی پڑے جیسی بحثوں میں وہ پڑے تھے۔ سو ان کا انجام یہ ہوا کہ دنیا اور آخرت میں ان کا سب کیا دھرا ضائع ہو گیا وہی اب خسارے میں ہیں کیا ان لوگوں کو اپنے پیش رووں کی تاریخ نہیں پہنچی نوح کی قوم، عاد، ثمود، ابراہیم کی قوم، مدین کے لوگ اور وہ بستیاں جنہیں الٹ دیا گیا۔ ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے پھر یہ اللہ کا کام نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ مال و اولاد کی کثرت اور قوت و طاقت کی فراوانی قانونِ الٰہی کو بدل نہیں سکتی۔ وہ قادرِ مطلق جس نے ماضی میں بڑی بڑی طاقتور قوموں کو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا تھا وہ تمہیں بھی تمہارے جاہ و مال کے باوجود گمراہیوں کی سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

تمہارے ان معاشی منصوبوں کے چرچے، تمہاری اس سیادت اور قیادت کے غلغلے، تمہاری یہ انجمن سازیاں اور جتھہ بندیاں، الغرض تمہاری یہ ساری نعرہ بازیاں اور کمزوروں کو مرعوب بلکہ خوفزدہ کرنے کے مختلف ہتھکنڈے تمہیں خدا کی گرفت سے کسی طرح بچا نہیں سکتے۔ اُس کی پکڑ بڑی مضبوط ہے اور جب وہ ذات کسی پر اپنا ہاتھ ڈال دیتی تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اُس سے نجات نہیں دلوا سکتی۔ تم بلند بانگ دعوے کر کے ممکن ہے کچھ مدت تک اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ سکو مگر جس دن اُس خالقِ کائنات نے تمہارا احتساب شروع کیا تو پھر تمہارے لیے کوئی جائے قرار نہ ہوگی۔ اُس دن سانپوں، بچھوؤں، شیروں اور چیتوں تک کو تو ممکن ہے سر چھپانے کے لیے جگہ میسر آجائے مگر تمہیں اس کرۂ ارضی کا کوئی کونہ پناہ دینے کے لیے تیار نہ ہوگا اور زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہو جائے گی۔ اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ تم سے پہلے ہزاروں طاقتور گروہ اس دھرتی کے سینے پر اُبھرے۔ انہوں نے قوت و طاقت کو غلام بنایا اور پھر پوری دنیا پر چھا گئے مگر کچھ مدت کے بعد ہی جب انہوں نے خداوند تعالیٰ سے روگردانی کی تو وہ دنیا سے اس طرح نیست و نابود کر دیئے گئے کہ آج اُن کا کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا۔ تاریخ کے یہی اوراق جن سے ان کی حیات کی داستانیں مزین تھیں پھر اُن کے مدفن بنے۔ اس بنا پر یہ کوئی عقلمندی کی بات نہیں کہ تم ایک عارضی اور ناپائیدار قوت و طاقت حاصل ہونے کے بعد اپنے دماغی توازن کو کھو بیٹھو اور اس کے نشہ میں آکر ایسی حرکات و سکنات شروع کر دو جو تمہیں سربلندی کی طرف لے جانے والی نہیں بلکہ دنیا اور آخرت میں ذلیل و خوار کرنے والی ہیں۔ مسند اقتدار جسے تم نے ہمیشہ اور مستقل رہنے والی چیز سمجھ کر اُس پر تکیہ کیا ہوا ہے۔ اُس نے آج تک کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ بیت عنکبوت بھی اس کے مقابلے میں زیادہ پائیدار اور دیرپا ہے۔ اس بنا پر تم پرلے درجے کے احمق ہوگے اگر اس کے طلسم میں گرفتار ہو کر اپنی بربادی کے خود اپنے ہاتھوں سے تجربے کرنے لگو۔ تمہارے سامنے گزشتہ اقوام کی جو مختلف داستانیں بکھری پڑی ہیں تمہیں اُن کا عبرت کی نگاہ سے مطالعہ کرنا چاہیے۔

اور ان سے سبق حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ جب تمہارا اندازِ زیست اُن تباہ شدہ قوموں کے انداز سے ملتا جلتا ہے تو تم بھی لازمی طور پر اُنہی بربادیوں سے دوچار ہو گے جن سے وہ دوچار ہوتی تھیں۔ جب تمہاری منزل وہی ہے جو ان کی تھی اور تمہارے قدم بھی اُسی سمت کی طرف اٹھ رہے ہیں جس سمت اُن کے اٹھتے رہے ہیں تو تمہارا انجام آخر کار وہی ہو گا جو ان کا ہوا تھا تمہیں اس مآل کار سے دنیا کی کوئی چیز محفوظ نہیں رکھ سکتی۔

قرآن مجید پھر بعض دوسرے مقامات پر اُن اسباب کی بھی نشاندہی کرتا ہے جن کی وجہ سے دنیا کی طاقتور قومیں ماضی کے حالات و واقعات سے عبرت نہیں پکڑتیں۔

فَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ - (الحج: ۴۶)

غرض کتنی بستیاں ایسی ہیں جنہیں ہم نے ان کی نافرمانی کی وجہ سے ہلاک کیا (سو اب اُن کی کیفیت یہ ہے) کہ وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں (اور اسی طرح ان بستیوں میں) کتنے کنوئیں بیکار اور کتنے مضبوط محلات ویران پڑے ہیں کیا ان لوگوں نے ان بستیوں میں گھوم پھر کر نہیں دیکھا تاکہ ان کے دل غور و فکر کے لیے بیدار ہوں یا ان کے کانوں میں سُننے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی حقیقت یہ ہے کہ (ان نافہموں) کی بصارت زائل نہیں ہو جاتی بلکہ ان کے دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔

اس ضمن میں قرآن حکیم سب سے پہلی کمزوری جس سے انسانوں کو روشناس کراتا ہے وہ بصیرت کا فقدان ہے۔ وہ لوگ جو آنکھوں کے باوجود عبرت انگیز واقعات سے عبرت حاصل نہیں کرتے اُن کی دل کی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں۔ وہ دیکھتے تو ہیں مگر دیدۂ عبرت سے

نہیں دیکھتے اور دنیا کے فکر انگیز حالات اُن کے اندر غور و خوض کی کوئی تحریک نہیں کرتے اُن کے قلوب احساسات و جذبات کے مخزن نہیں رہتے جن کے تاروں میں ارتعاش پیدا کیا جا سکے بلکہ وہ محض پتھر کے ٹکڑے بن جاتے ہیں جنہیں بڑے سے بڑے حادثات بھی متاثر کرنے میں یکسر ناکام ہوتے ہیں۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ	(بدعملیوں اور شقاوتوں کی وجہ سے) تمہارے
ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً	دل سخت ہو گئے ہیں ایسے سخت گویا پتھر کی چٹانیں
(البقرہ: ۷۴)	ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت۔

فکر و نظر کے اس عارضے سے پھر اُن کے اندر مختلف قسم کی ذہنی اور اخلاقی بیماریاں پرورش پانے لگتی ہیں جن میں غالباً سب سے خطرناک بیماری اُن کے قلب و نگاہ کی تبدیلی ہے۔ اس تبدیلی سے اُن کے فکر و نظر کے زاویے یکسر متغیر ہو جاتے ہیں اور اس طرح اُن کے خیر و شر کے پیمانوں میں بھی بہت نمایاں تبدیلیاں واقع ہونے لگتی ہیں۔ وہ شخص جن کی نگاہ کے مراکز اپنے اصل مقام سے ہٹ چکے ہوں جس طرح وہ مختلف اشیاء اور مناظر کو ہمیشہ غلط زاویوں سے دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے اور ان کے حسن و جمال کا صحیح صحیح اندازہ لگانے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے بالکل اسی طرح نگاہ کے اس ٹیڑھ کی وجہ اُس کے خوب و ناخوب کے معیار بھی یکسر بدل جاتے ہیں جن افکار و اعمال کو خداوند تعالیٰ نے نوعِ بشری کے لیے مضرت رساں قرار دیا ہے وہ اس کی نظروں کو مفتوح کر لیتے ہیں اور وہ انسانیت کی فلاح و بقا اُنہیں میں دیکھنے لگتا ہے اور ان کے برعکس جن چیزوں کو اللہ نے پسند فرمایا ہے اور انہیں اپنانے کا حکم دیا ہے وہ اس کی نظروں میں ناپسندیدہ ٹھہرتی ہیں اور وہ اُن سے ہر گام پر بچنے کی سعی کرتا ہے۔ "خوب و ناخوب" کی اس تبدیلی سے خیر و شر کے سارے معیارات بدل کر رہ جاتے ہیں اور افراد اور قومیں ایک عجیب و غریب مخمصے

ہیں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَعَادًا وَّثَمُوْدَا وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ۔ (العنکبوت ۳۸)

اور ہم نے عاد اور ثمود کو بھی (ان کے عناد کی وجہ سے) ہلاک کیا اور اُن کی یہ ہلاکت انگیزی تمہیں اُن کی رہائش گاہوں سے صاف نظر آ رہی ہے (اور وہ اس انجام بد کو اس بنا پر پہنچے کہ شیطان نے اُن کے (برے) اعمال کو اُن کی نظروں میں مستحسن کر رکھا تھا اور اس طریق سے انہیں راہ حق سے روک دیا تھا حالانکہ وہ اپنے نزدیک عقلمند تھے

دنیا میں کسی فرد یا قوم کے لیے اس سے زیادہ آزمائش اور کون سی ہو سکتی ہے کہ اُس کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو ہی بالکل الٹ کر رکھ دیا جائے اور اس طرح ذم مدح میں، معائب محاسن میں اور مثالب مناقب میں اُس کے سامنے جلوہ گر ہونے لگیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ پھر یہ تبدیلی بھی متناسب اور متوازن نہیں ہوتی بلکہ انسان کے قلب و دماغ کے اندر ایک ایسا انتشار رونما ہوتا ہے جو اُس کی زندگی کے سارے شعبوں کو متزلزل کر دیتا ہے اور اس کی حیات مستعار کے پورے لمحات ایک قسم کے ذہنی اور اخلاقی بحران میں گزرتے ہیں۔ اس کی ذات سے انسانیت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ اُس کی ساری صلاحیتیں اور قلب و دماغ کی پوری قوتیں تخریبی کارروائیوں میں صرف ہوتی رہتی ہیں۔

اس منتشر قلب و دماغ کے اندر چونکہ وہ اخلاقی جرأت ختم ہو جاتی ہے جو کسی فرد یا قوم کو اعترافِ حقیقت پر ابھارتی ہے اس لیے وہ اپنی بداعمالیوں کو برحق ثابت

کرنے کے لیے نوعِ انسانی کے اندر ایک مصنوعی برتری کی نمائش شروع کر دیتا ہے۔ اعترافِ گناہ درحقیقت ایک نہایت ہی اونچا وصف ہے اور اس کی وہ شخص جرأت کر سکتا ہے جو ذہنی اور قلبی اعتبار سے بالکل تندرست اور توانا ہو۔ ایک بیمار دل کے اندر اتنی طاقت ہی نہیں رہتی کہ وہ اتنا عظیم کام سرانجام دے سکے۔ اس لیے وہ لوگ جو ذہنی اور قلبی عارضوں کا شکار ہوتے ہیں وہ حق و صداقت کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے استکبار کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے آپ کو کچھ مدت تک اس دھوکہ میں مبتلا رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ وہ حق کی راہ پر گامزن ہیں۔ کسی میں یہ دم خم نہیں کہ وہ انہیں اُن کی کسی غلط حرکت پر ٹوک سکے۔ چونکہ حق کی منزل ایک کٹھن منزل ہے اس لیے وہ ہمیشہ اس بات کے درپے رہتے ہیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اُسے ہی لوگ حق سمجھ کر اُس کی بلاچون و چرا پیروی کرنے لگیں تاکہ کچھ عرصہ کے لیے اُن کے جذبۂ نخوت کی تسکین ہوتی رہے اور حقائق کی تلخیاں اُن کے قوت و طاقت کے نشے کو اُتار نہ دیں۔

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ۔ (العنکبوت: ۳۹)

اور ہم نے قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی (ان کے کفر کے سبب) ہلاک کیا اور ان (تینوں) کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) کھلی دلیلیں (حق) لیکر آئے تھے پھر ان لوگوں نے زمین میں استکبار کی روش اختیار کی مگر وہ ہمارے مقابلے میں جیت نہ سکے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح الفاظ میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ قارون، فرعون اور ہامان کو قبولِ حق سے جس چیز نے منع کیا وہ استکبار تھا۔ ان بدنصیب لوگوں کا مغرورانہ احساس اُن کے جذبات و احساسات کے ساتھ مسلسل چمٹا رہا اور انہیں حق کی طرف بڑھنے کا موقع نہ دیا۔ حق کا تسلیم کرنا دراصل اعترافِ حقیقت ہے اور یہ گمراہ لوگ اپنے اندر ہمت نہیں پاتے کہ اس کی طرف خالی الذہن ہو کر توجہ دے سکیں

وہ ہمیشہ اسی آرزو میں ہمت آزما رہتے ہیں کہ باطل افکار و نظریات کے جو شیش محل انہوں نے تیار کر رکھے ہیں انہیں کسی قسم کا صدمہ نہ پہنچنے پائے اور غلط خواہشات کے جو جالے انہوں نے اپنے اردگرد بُنے ہوتے ہیں کوئی انہیں چھونے کی ہمت نہ کرے۔ وہ اپنی زندگیاں انہی بدمستیوں میں بسر کرتے رہیں اور کوئی ان سے یہ نہ کہے کہ حضور آپ غلط راہوں پر بھاگے جا رہے ہیں۔

آپ اگر "استکبار" کے اجزائے ترکیبی پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا خمیر خود فریبی سے اٹھایا گیا ہے۔ اس کے مظاہر بلاشبہ کئی ایک ہوتے ہیں مگر اس کا اصل محرک صرف خود فریبی ہی ہے۔ ایک شخص جب حقیقت کا مقابلہ کرنے کی اپنے آپ میں ہمت اور طاقت نہیں پاتا تو پھر وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے اس مصنوعی طرزِ عمل کو اختیار کرتا ہے۔ یہ روش دراصل حق کے مقابلے میں ایک شکست خوردہ احساس کی بدیہی علامت ہے۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ اُس کے اندر حقائق کا سامنا کرنے کی کوئی طاقت اور ہمت نہیں۔ چنانچہ جدید نفسیات کے ماہرین نے بڑے واضح دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ قوت و طاقت کے حصول کے لیے اور پھر اس کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے دنیا کے برسرِ اقتدار طبقے جو مختلف قسم کے نمائشی کام کرتے ہیں اُن کی تہ میں یہی احساسِ شکست کارفرما ہوتا ہے۔ وہ چونکہ اپنے اندر حقیقی عظمت کے کسی جوہر کی پرورش نہیں کر پاتے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانی نوع پر تفوق اور برتری جتلانے کے بھی آرزومند ہوتے ہیں اس لیے وہ اس خلا کو مختلف قسم کے نمائشی کام کر کے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ مال و متاع پر فخر و غرور، یہ جاہ و جلال کے تذکرے، یہ قوت و طاقت کے غلغلے اور ہر اختلاف کرنے والے کو تحدی یہ سب اسی احساسِ شکست کے مختلف شاخسانے ہیں۔

قرآن مجید نے اپنے مخصوص بلیغانہ انداز میں اسی حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ حق سے اعراض کرنے والے اور اس کا راستہ روکنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر ایک طرف تو اسی نوعیت کی شکست خوردہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنی سوسائٹی میں اپنے آپ کو مقتدر ہستیاں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ مختلف مقامات پر قرآن حکیم نے جو اُن کے تذکرے کیے ہیں اُن سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

جب حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کو اطاعتِ خداوندی کی دعوت دی اور اسے عذابِ الٰہی سے ڈرایا تو اس قوم کے برسرِ اقتدار لوگوں نے اس دعوت کے جواب میں جو بات کہی وہ اس جذبۂ نخوت کی نہایت کھلی غمازی کرتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۙ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ۔ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَمَا نَرٰی لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ۔ (ہود-۳)

(اور ایسے ہی حالات تھے جب) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا (اس نے کہا) "میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا" جواب میں اس کی قوم کے سردار جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے "ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے جو لوگ کمین اور رذیل تھے ان کے سوا کسی نے بھی تمہاری پیروی نہیں کی اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس سے تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔

"قوم کے ان سرداروں کا یہ جواب دراصل کسی مخصوص عہد یا مخصوص ماحول یا مخصوص اشخاص سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ اُس عام روش کا اظہار ہے جو برسرِ اقتدار گروہ حق کے مقابلے میں اختیار کرتا ہے۔ انہیں حق کے قبول کرنے میں جو چیز فراہم ہو رہی تھی وہ یہی تھی کہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لینے کے بعد ان کی اپنی خدائی کا قصر پیوند خاک ہو جائیگا پھر اُن کی قوم کے اندر اُن کی کبریائی کا وہ سکہ نہ چل سکے گا جو برسوں سے چلتا چلا آ رہا ہے۔ اور جس کی وجہ سے وہ اپنے معاشرے میں ناکارہ ہونے کے باوجود زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مفسرین نے اَلْمَلَأُ کی جو تعریف کی ہے اسی سے اُن کے اندازِ فکر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دل و دماغ میں حبِ جاہ، شہرت کی ہوس اور سیادت و قیادت کی انتہائی خواہش اور خود غرضی موجود ہو۔ یہ لوگ حق و صداقت کے کچھ اس وجہ سے دشمن نہ تھے کہ اسے وہ اپنی قوم اور ملت کے لیے مضرت رساں اور نقصان دہ خیال کرتے۔ اُن کی دشمنی کا سارا دارو مدار صرف اس بات پر تھا کہ اسے قبول کر لینے کے بعد پھر اُن کے جذبۂ نخوت کی تسکین نہ ہو سکے گی۔ معاشرے میں جو بلند و بالا مقام انہیں حاصل ہے اور جس غیر مسئول اقتدار کے وہ رسیا ہیں اُسے پھر وہ قائم نہ رکھ سکیں گے۔ حق کے سامنے سرنگوں ہو جانے کے بعد وہ انسانوں میں محض ایک انسان کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں گے اور اپنی کبریائی اور خدائی کے جو ٹھاٹھ انہوں نے قائم کر رکھے ہیں پھر ان کی حفاظت و پاسبانی نہ ہو سکے گی۔ سوسائٹی کے مختلف طبقات میں انہوں نے تفوق کی جو غلط فضا قائم کر رکھی ہے اُس کا طلسم ٹوٹ جاتے گا۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر اس کی تصریح حضرت شعیب علیہ السلام کی زبان سے یوں فرمائی گئی ہے:

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا	اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی
قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ	شعیب کو بھیجا اس نے کہا اے برادرانِ قوم!

غَيْرُهٗ ط قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ . . . . . قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۔ (الاعراف: ۸۵ و ۸۸)

اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف رہنمائی آگئی ہے لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو۔ لوگوں کو اُن کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔ . . . . اس کی قوم کے سرداروں نے جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اُس سے کہا کہ اے شعیبؑ ہم تجھے اور اُن لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔

یہ آیات غلط کار قیادت کے انداز فکر کی نہایت واضح الفاظ میں ترجمانی کرتی ہیں۔ مدین والوں کو جب خدا خوفی، پرہیزگاری اور باہمی لین دین میں دیانت داری کا مسلک اختیار کرنے کی دعوت دی گئی تو اس دعوت سے اُس قوم کے برسر اقتدار حلقوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور وہ اس بات پر سخت برہم ہوئے کہ کوئی شخص اُن کے انداز فکر اور انداز زیست میں ایسی تبدیلی کرنے کا ارادہ کر رہا ہے جس سے ان کی قیادت اور سیادت کے قصر میں شگاف پڑنے کا خطرہ تھا۔ اُن کے دماغ کا مغرورانہ احساس کسی ایسی بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا جو انہیں حق پرستی کی دعوت دے اور اُن سے اس بات کا مطالبہ کرے کہ وہ حرام طریقوں سے مال و دولت کمانے کا وطیرہ ترک کر دیں۔ حق کی دعوت کو قبول کرنا تو درکنار وہ اس بات کو بھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ وہ کسی ایسے شخص کو اپنے معاشرہ میں زندہ رہنے کا موقع دیں جو خلق خدا کو نیکی اور پاکیزگی کی

دعوت دے اور ان سے کہے کہ تم ان جھوٹے خداؤں کی پرستش چھوڑ کر اُس خالق کی پرستش اختیار کرو جو تمہارا مالک اور قانون ساز ہے۔

جھوٹی خدائی کے ان دعویداروں کی ذہنیتیں اس قدر بگڑ چکی تھیں کہ وہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے ہر کام کو ہدفِ استہزاء بناتے اور خدا کا اگر کوئی صالح اور پاکباز بندہ انہیں ان کی ان بُری حرکات پر ٹوکتا تو وہ اس کی اس پاکبازانہ زندگی پر پھبتی کس کر اس کی شخصیت کا استخفاف کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا کے نیک بندوں کی تضحیک کر دینے سے وہ انہیں اور اُن کے مقدس کارناموں کو لوگوں کی نظروں میں بے وزن بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے مگر یہ محض ان کا فریبِ نظر تھا۔ وہ یہ ساری نازیبا حرکات احساس کہتری میں مبتلا ہو کر کر رہے تھے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ دلائل ان کا ساتھ نہیں دے رہے، حق اور انصاف اُن کے مخالف ہے اور خود اُن کے اپنے ضمیر میں اتنی سکت نہیں کہ وہ ان کی بداعمالیوں کی بغیر کسی خلش کے تائید کر سکے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے اُن کی دعوت کے جواب میں جو الفاظ کہے وہ اسی ذہنیت کی پوری طرح غمازی کرتے ہیں:

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُسْرِفُونَ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ

(الاعراف: ۸۰-۸۱-۸۲)

اور لوط نے جب اپنی قوم سے کہا "کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گذر جانے والے لوگ ہو"، مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ نکالو ان لوگوں کو بستی سے، بڑے پاکباز بنتے ہیں یہ۔